A Critical & Analytical Study of Younas Javed's autobiography "Sirf Aik Aansoo"

یونس جاوید کی آپ بیتی ''صرف ایک آنسو'' کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

Ghulam Shabbir *[1]
Lecturer Urdu, Govt. Degree College of Special Education, Multan
Dr. Syed Zaigham Abbas *[2]
Urdu Teacher, Workers Welfare School, Multan

☆[1] غلام شبیر
لیکچرار اردو (ڈیپارٹمنٹ آف اردو) گورنمنٹ ڈگری کالج آف سپیشل ایجوکیشن ملتان۔
☆[2] ڈاکٹر سید ضیغم عباس
ٹیچر آف اردو، ورکرز ویلفیئر سکول، ملتان

Correspondance: gs3047373962@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 05-04-2026
Accepted:27-06-2026
Online:28-06-2026

Copyright:© 2026 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: This research article studies Sirf Aik Aansoo, the autobiography of Younas Javed, as an important reflection of personal pain and social problems in Pakistani society. The autobiography is not only the story of the writer's life but also a picture of the difficulties faced by common people after Partition. Through his memories, Younas Javed describes childhood struggles, harsh experiences in madrassas, educational hardships, office corruption, literary politics, and social injustice. The study explains how the title Sirf Aik Aansoo ("Only a Tear") represents silent suffering, helplessness, and emotional pain. The article also discusses the writer's simple but powerful style, realistic narration, and honest expression of truth. Different events in the autobiography reveal the cruelty of institutions, unfair treatment in society, and the problems faced by talented individuals in educational and literary circles. Using a critical approach, this research highlights the social, psychological,

and literary aspects of the autobiography. It shows how Younas Javed connects his personal experiences with larger social realities. “Only one tear” stands as an authentic document depicting parallel circumstances and events of Younas Javed and Majlis –e Taraqi Adab Lahore .The autobiography presents the moral decline, corruption, and changing values of society in a very effective way. The research concludes that Sirf Aik Aansoo is an important work in modern Urdu autobiographical literature because it combines personal experiences with social criticism and presents the truth of society in a touching and realistic manner.

KEYWORDS: Autobiography, Urdu Literature, Younas Javed, Sirf Aik Aansoo, Social Issues, Pakistani Society, Realism, Literary Criticism, Partition, Educational Struggles, Majlis-E-Taraqi-E-Adab Lahore, Circumstances and event.

یونس جاوید ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔ دوسری اصناف ادب میں عمدہ کام کے ساتھ ساتھ ان کی خودنوشت کا کام بھی اپنی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے قلم کو ہمیشہ حق و صداقت کا ترجمان بنایا ہے۔ یونس جاوید کی خودنوشت ”صرف ایک آنسو“ کے عنوان سے ۲۰۲۱ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنی زندگی کے اہم واقعات اور تجربات کو کسی غیر معمولی دعوے یا مبالغے کے بغیر نہایت سادہ، بے ساختہ اور بے تکلفانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

"صرف ایک آنسو“ کا عنوان اپنے اندر گہری علامتی اور معنوی جہات سموئے ہوئے ہے۔ آنسو انسانی جذبات کا نہایت مؤثر استعارہ ہے جو غم، مسرت، بے بسی اور خاموش احتجاج جیسے مختلف احساسات کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس عنوان کا انتخاب اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ خودنوشت صبر، ضبط اور مسلسل برداشت سے عبارت ایک طویل زندگی کی داستان ہے جس کا نچوڑ محض ایک آنسو کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ ایک آنسو مصنف کی پوری زندگی کے ان دکھوں، آزمائشوں اور اندرونی کرب کا نمائندہ ہے جو بظاہر خاموشی کے ساتھ جھیلے گئے مگر جن کے پس منظر میں شدید ذہنی اور جذباتی ہنگامے برپا رہے۔ اس عنوان سے مظفر حنفی کا وہ تبصرہ بھی ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے جو انہوں نے ایک افسانے کے

حوالے سے کیا تھا کہ "ہونٹ سی لیے جائیں اور آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکے، لیکن افسانے کے اختتام پر قاری کی کیفیت ایسی ہو کہ وہ دل تھام کر رہ جائے۔" یونس جاوید کی یہ خود نوشت بھی اسی داخلی اثر اور جذباتی کیفیت کی آئینہ دار ہے، جہاں طویل بیانیہ آخر کار ایک خاموش آنسو کی صورت میں اپنی معنوی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس خود نوشت کو مختلف ذیلی عنوانات، یعنی "بیتے ہوئے دن یاد آتے ہیں"، "دودِ چراغِ محفل"، "نیا سفر"، "پرواز"، "صبحِ انتظار"، "سرشاری"، "پسِ دیوارِ زنداں"، "پلِ صراط" اور "چراغِ آخرِ شب" کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔

ابتدا میں یونس جاوید نے اپنی اس خود نوشت کا عنوان "پورٹریٹ" تجویز کیا تھا، بعد ازاں اسے تبدیل کر کے "صرف ایک آنسو" رکھ دیا۔ عنوان کی اس تبدیلی کے پس منظر اور اس کی معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف نے کتاب کے "ابتدائیہ" میں اپنی رائے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> "اس کتاب کا نام پہلے پورٹریٹ رکھا تھا۔۔۔ پورٹریٹ۔۔۔ کس کا؟۔۔۔ اپنا؟۔۔۔ کسی گارڈ فادر کا یا اس گندگی سے اٹے معاشرے کا؟۔۔۔ معاشرہ ہے کہاں۔۔۔۔ یہ گناہوں کا منبع اور غلاظتوں کا مذبح خانہ ہے جہاں ہر روز پھول جیسی معصوم بچیوں کو ریپ کر کے قتل کر دیا جاتا ہے جہاں باحیا خواتین کو اُن کے بچوں اور بعض اوقات شوہروں کے سامنے بے عزت کر دیا جاتا ہے۔ معاشرہ منہ پھیر کر دیکھتا ہے نہ درد محسوس کرتا ہے۔ یہ بے ضمیر لوگوں کا جمِ غفیر ہے جو ظلم اور گناہوں کی خبروں سے حظ اٹھانے لگا ہے ۔۔۔ تف ہے اس معاشرے پر جس کے برابر کے ذمہ دار ہم بھی ہیں۔ جی ہاں ہم بھی مجرم ہیں۔"(۱)

یونس جاوید نے ابتدائیہ میں اپنے عہد کے معاشرتی زوال کا نہایت فکر انگیز انداز میں جائزہ لیا ہے۔ وہ ایسے معاشرے کی تصویر پیش کرتے ہیں جہاں بے حسی، بے غیرتی، ظلم، جبر، تشدد، حرص اور طمع عام ہو چکے ہیں۔ ان کے مطابق دولت کی اندھی خواہش نے انسان کو صرف مال و زر کے حصول تک محدود کر دیا ہے، جبکہ اخلاقی تربیت کے فقدان نے معاشرے کو مسلسل انحطاط کی طرف دھکیل دیا ہے۔ مصنف اس امر پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ انسان خود شناسی کے عمل سے دور ہو گیا ہے۔ اس نے نہ اپنی ذات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور نہ کبھی اپنے باطن کا جائزہ لیا ہے۔ یہی غفلت اجتماعی زوال کا سبب بنی اور قوم کو ایسے مقام پر پہنچا دیا جہاں ہر طرف محرومی، افسردگی اور ماتم کی فضا دکھائی دیتی ہے۔ انہی خیالات کے تسلسل میں یونس جاوید اپنی خود نوشت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے تئیں صرف دس فیصد سچ لکھا ہے نوے فیصد گندگی پر پردہ ڈال دیا ہے کہ غلاظت نگاری میرا شیوہ نہیں۔ نہ ہی گندگی سے دوسروں کے لئے حظ کا سامان کیا ہے۔ اس ساری صورتحال پر میرا ایک آنسو ٹپکا ہے۔ یہی میرے پاس بچا تھا یہی پیش ہے۔ جی ہاں۔۔۔ صرف ایک آنسو!''(۲)

یونس جاوید ''بیتے ہوئے دن'' کے عنوان سے اپنے بچپن کی یادوں اور ابتدائی زندگی کے حالات کو نہایت سادہ مگر مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ تقسیمِ ہند کے وقت ان کی عمر تقریباً چار برس تھی، اس لیے فسادات کی ہولناک فضا، قتل و غارت، کرفیو، ظلم و تشدد، اشتعال انگیز نعرے اور ریڈیو سے نشر ہونے والی آواز ''یہ ریڈیو پاکستان ہے'' ان کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑ گئی۔ ان کی پیدائش یار پورہ، تحصیل شادرہ میں ہوئی۔ وہ اپنی زندگی کی داستان بچپن سے شروع کرتے ہیں اور ان دنوں کا ذکر کرتے ہیں جب انار کلی بازار میں گھومنا پھرنا، نیکر والی اسکول یونیفارم پہن کر خوشی خوشی تعلیم کے لیے جانا اور واپسی پر والد کی دکان سے ہوتے ہوئے گھر پہنچنا ان کے معمولات میں شامل تھا۔ یہ سلسلہ اس وقت اچانک بدل گیا جب ان کی رسمی تعلیم منقطع کر کے انہیں مولانا فضل کریم کے سپرد کر دیا گیا۔ اس موقع پر مٹھائی بھی تقسیم کی گئی اور مولانا انہیں اپنے مدرسے لے گئے۔ یہ فیصلہ ان کی مرضی کے خلاف تھا، اس لیے وہ خود کو بے اختیار محسوس کرتے رہے۔ اگرچہ اس کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کے جذبات ان کے اندر نہایت خاموشی سے پروان چڑھتے رہے۔ مدرسے سے جب فرصت ملتی وہ اپنے اندر کی گھٹن کم کرنے کے لیے لائبریری کا رخ کرتے، جہاں مطالعہ ان کی پناہ گاہ بن گیا۔ ابتدا میں انہوں نے مرزا ادیب کی تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا اور اسی شوق نے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ بالآخر انہوں نے قرآنِ مجید حفظ کر لیا، لیکن مدرسے میں قاری صاحب کی جانب سے طلبہ پر ہونے والے جسمانی تشدد کے مناظر بھی ان کے حافظے میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گئے۔ جب ان کی عمر صرف سولہ برس تھی تو انہوں نے اپنا پہلا ناول ''آخرِ شب'' تحریر کیا، جس کی زبان و بیان میں مرزا ادیب کے اسلوب کے نمایاں اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ یہ ناول اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ یونس جاوید میں ادبی ذوق اور تخلیقی صلاحیت بچپن ہی سے موجود تھی۔ ان کا پہلا ناول ''آخرِ شب'' بعد ازاں ادارہ نو نے اکتوبر ۱۹۶۲ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ والد کی ہدایت پر وہ اس مسجد میں تراویح پڑھانے لگے جہاں ان کے دادا امامت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ مدرسے میں طلبہ کے ساتھ ہونے والے سخت رویے اور جسمانی سزاؤں کا ان پر گہرا اثر تھا، اسی خوف کے باعث وہ اپنا سبق جلد از جلد یاد کرنے کی کوشش کرتے تاکہ سزا سے محفوظ رہ سکیں۔

اپنی خودنوشت میں یونس جاوید ایک قصائی کے بیٹے کا واقعہ بھی بیان کرتے ہیں، جو قرآنِ مجید حفظ کرنے میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور فطری طور پر آزادی پسند اور باغی مزاج کا حامل تھا۔ وہ کئی مرتبہ مدرسے سے فرار ہونے کی کوشش کرتا، لیکن ہر بار اسے پکڑ کر واپس لایا جاتا۔ واپسی پر مولوی صاحب اسے مرغا بنا کر سخت جسمانی سزا دیتے، جس کی شدت نے

اس کے ذہن پر گہرے اثرات چھوڑے۔ جب اس کی مسلسل فرار کی کوششیں جاری رہیں تو اس کے والد نے اس کی نقل و حرکت محدود کرنے کے لیے تقریباً چوبیس فٹ لمبی زنجیر باندھ دی تا کہ وہ صرف استاد کے پاس جانے یا بیت الخلا تک آنے جانے کی اجازت کے ساتھ رہ سکے۔ مگر اس نے ایک دن اس زنجیر کو بھی کاٹ ڈالا اور مدرسے سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ اس کے بعد نہ وہ دوبارہ دکھائی دیا اور نہ ہی اس کے بارے میں کوئی اطلاع مل سکی۔

یونس جاوید نے اپنی خودنوشت میں ذاتی زندگی کے واقعات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں رائج بعض تلخ اور تشویش ناک رویّوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔ وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ والدین اکثر اپنے کم سن بچوں کی خواہشات اور رجحانات کو نظر انداز کرتے ہوئے انہیں ایسے مذہبی اساتذہ کے سپرد کر دیتے ہیں جہاں سختی اور جسمانی سزائیں معمول کا حصہ ہوتی ہیں۔ اس صورتِ حال کی نمایاں مثال متین کا واقعہ ہے جس کے ذریعے مصنف نے بچوں پر ہونے والے نفسیاتی اور جسمانی تشدد کی شدت کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے نزدیک بچوں کی رائے اور پسند کو اہمیت دیے بغیر ان پر فیصلے مسلط کر دیے جاتے ہیں جبکہ مدارس میں بعض مقامات پر ان کے ساتھ روا رکھا جانے والا سخت اور غیر انسانی برتاؤ ان کی شخصیت پر دیرپا منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ اسی تناظر میں وہ مدرسے کے ماحول اور وہاں بچوں پر ڈھائے جانے والے تشدد کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''ہمارے اس مدرسہ میں جو شخص بھی اپنا بچہ داخل کرانے آتا، وہ قاری فضل کریم سے کھل کر یہ کہتا ''حضرت جی، گوشت آپ کا ہڈیاں ہماری'' شروع میں تو میں سمجھا کہ یہ لوگ بغیر ہڈی والا گوشت سپلائی کرتے ہیں اور مدرسے کے لئے خصوصی رعائیت کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر ایک روز ایک سینئر لڑکے کو سبق یاد نہ ہونے پر جس سنگدلانہ طریقے سے پیٹا اور بار بار مرغا بنا کر لات مار کر گرایا گیا، میں دیکھ کر گُنگ ہو گیا۔ میرے اوپر نیچے والے دانت آپس میں پیوست ہو گئے اور یعقوب نامی لڑکے کی مار سے درد مجھے محسوس ہونے لگی۔''(۳)

یونس جاوید نے مدرسے میں قرآنِ مجید حفظ کرنے کے دوران قاری صاحبان کی جانب سے طلبہ پر کیے جانے والے سخت جسمانی تشدد اور بے رحمانہ سلوک کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ دل دہلا دینے والے مناظر ان کی یادداشت کا یوں حصہ بنے کہ وقت گزرنے کے باوجود ان کے اثرات مدھم نہ ہو سکے۔ ان کے لیے، ان واقعات کو فراموش کرنا تو در کنار، ان کی ہولناکی آج بھی اسی شدت کے ساتھ ان کے ذہن پر ثبت ہے۔

یونس جاوید ''بیتے ہوئے دن یاد آتے ہیں'' کے عنوان کے تحت مدارس کے نظامِ تعلیم سے وابستہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ اس امر پر روشنی ڈالتے ہیں کہ بعض مدارس میں معصوم بچوں کو نظم و ضبط کے نام پر سخت جسمانی سزاؤں اور تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ مذہبی تعلیم کے نام پر بچوں کو ایسے قاری صاحبان اور مولویوں کے سپرد کر دیا جاتا جہاں انہیں سخت رویّے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یونس جاوید نے اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں ان حالات کی عکاسی کرتے ہوئے معاشرے کے سامنے مدرسہ تعلیم کے اس تلخ اور کم زیرِ بحث پہلو کو بے نقاب کیا ہے تاکہ بچوں کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک اور سزا کے نام پر روا رکھے جانے والے تشدد کی حقیقت واضح ہو سکے۔

یونس جاوید ''دودِ چراغِ محفل'' کے عنوان کے تحت انار کلی بازار میں قائم اپنے والد کی دکان ''اے حمید سنز سٹیشنرز'' کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ دکان درآمد شدہ قلم فروخت کرنے کے حوالے سے معروف تھی جہاں اس دور کے متعدد ممتاز اہلِ قلم اور ادیب آتے تھے۔ ان کے مطابق انہیں اسی دکان پر عابد علی عابد، احسان دانش، سید عبداللہ، سید وقار عظیم، ڈاکٹر عنایت اللہ اور فیض احمد فیض جیسی نامور ادبی شخصیات کو قریب سے دیکھنے اور ان سے ملاقات کا موقع ملا۔ وہ اس حقیقت کی بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ تقسیمِ ہند سے قبل انار کلی بازار میں مسلمانوں کی دکانیں بہت کم تھیں جبکہ بیشتر کاروباری مراکز ہندو تاجروں کی ملکیت تھے۔ تقسیم کے بعد جب ہندو برادری ہجرت کر گئی تو ان میں سے متعدد دکانیں غیر قانونی ذرائع سے مختلف افراد کے نام الاٹ کر دی گئیں۔ اسی دوران ان کے والد کی دکان بھی ان سے خالی کروالی گئی جس کے باعث خاندان کو مالی اور معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

> ''زندگی میں دوسرا بڑا موڑ جس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا صرف گیارہ دنوں کے مقدمے کا فیصلہ سُنا کر ہمیں انار کلی والی دکان سے ڈیفالٹر قرار دے کر خالی کرنے کا حکم دیا گیا۔ والد صاحب حج کے لئے گئے ہوئے تھے۔ ان کی ہدایات پر میں نے نئے مالک دکان کو کرایہ منی آرڈر کرادیا تھا جو موصوف نے پوسٹ ماسٹر سے مل کر بیس روز بعد واپس کر دیا تھا کہ دیر سے بھیجا گیا ہے اور اندر ہی اندر مقدمہ بھی کر رکھا تھا۔ میں ناتجربہ کار یہ چال سمجھ ہی نہ سکتا تھا میرے اندر ایک گولا سا پھٹا۔''(۴)

یونس جاوید روزانہ دکان سے پانچ روپے لے لیا کرتے تھے۔ ان پانچ رپوں سے شام کے وقت دوستوں کے ساتھ کافی ہاؤس میں بیٹھک، گفتگو اور چائے کا اہتمام ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں پانچ روپے کی رقم خاصی اہمیت رکھتی تھی کیونکہ اس سے دس ہاف سیٹ چائے خریدی جاسکتی تھیں۔ کبھی کبھار وہ ویٹر کو آٹھ آنے بطور ٹپ بھی دے دیتے جس سے وہ بے حد خوش

ہوتا اور خوشی خوشی معروف شعرا کے ایسے اشعار سناتا جو اسے زبانی یاد ہوتے تھے لیکن دکان چھن جانے کے بعد انہیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ صورتِ حال اس وقت مزید سنگین ہوگئی جب محکمۂ بحالیات کی بدعنوانیوں اور رشوت خوری کی وجہ سے حقیقی حق دار مہاجر بھی اپنے جائز حقوق سے محروم رہ گئے۔ ان حالات کی عکاسی کرتے ہوئے یونس جاوید لکھتے ہیں:

> "شیخ منظور الٰہی صاحب۔۔۔ خطبہ صدارت میں فرمایا ہمارے قومی کردار کو برباد کرنے میں میرے ڈیپارٹمنٹ کا ہاتھ ہے۔ گویا میرے درد کو زبان مل گئی تھی۔۔۔ کہ کمشنر بحالیات کو بے بس کر دینے والے اس کے محکمے کے ہی لوگ کس قدر چالاک اور بددیانت ہیں اور یہ بھی کہ ایک عام کلرک کمشنر سے زیادہ دولت اور آسائشوں کا مالک کس طرح بنتا ہے۔ ہال میں سناٹا چھا گیا سب کو خبر تھی کہ الاٹ منٹوں کی لوٹ مار نے ہی کرپشن کے زہریلے سمندر کو جنم دے کر مستحق مہاجروں کو بھی ڈس لیا تھا اور سلطنت خداداد پاکستان کو بھی اس محکمے نے کرپشن، جھوٹ، مکاری اور لوٹ مار کی بنیاد رکھی تھی اور کچھ اس طرح کہ پوری عمارت کو ہی ٹیڑھا کر دیا تھا۔"(۵)

یونس جاوید نے میٹرک مکمل کرنے کے بعد "فیروز سنز" میں اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا جو ایک نجی ادارہ تھا اور جہاں نظم و ضبط کے قوانین انتہائی سخت تھے۔ دفتر میں دوپہر کے کھانے کے لیے بھی نہایت محدود وقت مقرر تھا جس کی پابندی ہر ملازم پر لازم تھی۔ اگر کوئی ملازم مقررہ وقت پر واپس نہ پہنچتا تو اس کی تنخواہ سے بطور جرمانہ کچھ رقم منہا کر لی جاتی تھی۔ یونس جاوید بھی ایک موقع پر اسی ضابطے کا شکار ہوئے جس پر انہوں نے اس ملازمت کو جاری رکھنے کے بجائے استعفیٰ دینا مناسب سمجھا۔ یونس جاوید لکھتے ہیں:

> "یہ ملازمت بیس روز ہی چل سکی کہ نگران کلرک نے آدھ گھنٹے چھٹی کو آدھے دن پر محیط قرار دے کر تنخواہ کاٹ لی تھی یوں بھی دوپہر کے کھانے کے لئے تیس منٹ دیے جاتے تھے سب لوگ بھاگم بھاگ وکٹوریہ پارک کی گلیوں میں گھٹیا چائے خانوں اور ٹھیلوں پر امنڈتے جلدی جلدی کچھ نگلتے اور بچا کھچا ہاتھوں میں لیے کھاتے نگلتے اس طرح بھاگتے ہوئے فیروز سنز واپس آتے۔ چند منٹ اوپر نیچے ہو جاتے، وارننگ معمول تھی سو بیس روز کی اس نوکری کے بعد میں نے استعفیٰ دے دیا۔"(۶)

یونس جاوید نے اپنی خود نوشت کے اس حصے (''دودِ چراغِ محفل'') میں تین اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ پہلی بات انہوں نے اپنے خاندانی کاروبار سے محرومی، دکان کو بدنیتی اور ناجائز طریقے سے خالی کرائے جانے کے دکھ اور اس ضمن میں پوسٹ ماسٹر کے غیر دیانت دارانہ کردار کو بیان کیا ہے۔ دوسرے پہلو میں انہوں نے تقسیمِ ہند کے بعد محکمۂ بحالیات میں رائج کرپشن، رشوت ستانی اور بے ضابطہ الاٹمنٹس کی نشاندہی کی ہے اور واضح کیا ہے کہ پاکستان کے ابتدائی دور ہی میں بدعنوانی نے انتظامی نظام کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ تیسرے نکتے کے طور پر انہوں نے اپنی نجی ملازمت کے تجربات بیان کرتے ہوئے پرائیویٹ ملازمین کو درپیش مشکلات، استحصالی رویّوں اور ان پر ہونے والی ناانصافیوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس طرح مصنف نے سرمایہ دارانہ نظام میں نجی اداروں کی سخت گیر پالیسیوں اور ملازمین کے ساتھ روا رکھے جانے والے غیر انسانی سلوک کو حقیقت پسندانہ انداز میں بے نقاب کیا ہے۔

''نیا سفر'' کے عنوان کے تحت یونس جاوید نے مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور سے اپنی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے عابد علی عابد اور سید امتیاز علی تاج کے بارے میں مختصر تعارف اور ان کے طرزِ عمل پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ دونوں علمی و ادبی شخصیات لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتی تھیں اور مصنف کے ساتھ بھی ان کا رویہ مشفقانہ تھا۔ امان عاصم کی وساطت سے ملازمت کے سلسلے میں ان کی ملاقات سید امتیاز علی تاج سے ہوئی جنہوں نے پروف ریڈنگ کا امتحان لینے کے بعد انہیں پچھتر روپے ماہانہ تنخواہ پر بطور پروف ریڈر ملازمت دے دی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب یونس جاوید نے باقاعدہ کہانی نویسی کا آغاز کیا۔ بقول یونس جاوید:

> ''جب میں ملازمت کے لئے مجلس ترقی ادب لاہور میں تاج صاحب سے
> ملا تو تنخواہ کے معاملے میں انہوں نے جب میرے سے پوچھا تو میں نے کہا
> : سر مجھے ماہنامہ شمع سے پچاس روپے ایک کہانی کے ملتے ہیں۔ ''لیل و نہار''
> اور ''امروز'' بھی اچھا معاوضہ دیتے ہیں۔ تو انہوں نے میری تنخواہ الاونسز
> سمیت دو دن بعد ہی ایک سو ساٹھ روپے کر دی۔ ''(۷)

حصولِ ملازمت کے بعد یونس جاوید کے اندر تعلیم کو مزید آگے بڑھانے کا شوق پیدا ہوا۔ انہوں نے خفیہ طور پر ایف۔اے کی تیاری شروع کی اور کسی کو زیادہ خبر ہوئے بغیر یہ امتحان بھی کامیابی سے پاس کر لیا۔ اس دوران انہیں بچپن کے وہ دن بھی یاد آتے ہیں جب ان کے والد انہیں سائیکل پر ساتھ لے جاتے ہوئے راستے میں ''یا حیُ یا قیوم'' کا ورد کروایا کرتے تھے۔ اسکول کے اوقات کے بعد وہ سیدھا دکان پر پہنچتے، جہاں نیئر معراج الدین انہیں خوش خطی کی تربیت دیتے تھے اور گھنٹوں ایک ایک حرف کی مشق کرواتے رہتے تھے۔ اس مسلسل محنت کے بعد جب وہ گھر لوٹتے تو تھکن اور نیند کے باعث ان کی آنکھیں بوجھل ہو چکی ہوتیں۔

دینی معاملات میں گھر کے اندر سختی کا ماحول پایا جاتا تھا، یہاں تک کہ چار رکعت نماز کے مختصر وقت میں ادائیگی پر بھی سوال اٹھایا جاتا تھا کہ یہ نماز پندرہ منٹ سے پہلے کیوں مکمل کر لی گئی۔ بعد ازاں جب وہ حافظِ قرآن بن گئے تو انہیں مسجد میں تراویح پڑھانے کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس دوران ابھی انہوں نے محنت سے تقریباً پچیس پارے ہی مکمل کیے تھے کہ اچانک ان کی طبیعت بگڑ گئی اور وہ بے ہوش ہو گئے جس پر انہیں گھر واپس پہنچا دیا گیا۔ طبیعت سنبھلنے کے بعد وہ آخری رات تراویح پڑھانے کے لیے دوبارہ مسجد گئے۔ اس موقع کے بعد مٹھائی تقسیم کی گئی اور ان کے والد کے لیے یہ ایک نہایت مسرت اور فخر کا لمحہ تھا۔

یونس جاوید اپنی خود نوشت کے اس حصے میں اپنی ملازمت کے تجربات اور پیشہ ورانہ سفر سے متعلق تفصیلات بیان کرتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور میں ملازمت اختیار کی اور ابتدائی طور پر ان کی تنخواہ پچھتر روپے مقرر ہوئی جو بعد ازاں بڑھ کر ایک سو ساٹھ روپے تک پہنچ گئی۔ اس مرحلے پر ان کی کہانیوں کی اشاعت اور ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ بھی سامنے آتا ہے۔ ساتھ ہی وہ ماضی کی طرف رجوع کرتے ہوئے اپنے بچپن کے مختلف تجربات، مسجد کے واقعات، والد کے ساتھ سائیکل پر سفر، دکان پر خطاطی کی تربیت اور گھر میں دینی سختیوں کو بھی یاد کرتے ہیں۔ اس طرح وہ بیانیے میں فلیش بیک کی تکنیک کو نہایت ہنر مندی سے استعمال کرتے ہیں جس سے قاری کے لیے متن زیادہ مربوط، دلچسپ اور اثر انگیز بن جاتا ہے۔

''پرواز'' میں وہ اپنے تعلیمی سفر سے متعلق آگاہ کرتے ہیں اور ان مسائل و مشکلات کا تذکرہ کرتے ہیں جو انہیں درپیش رہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ بی۔اے کی تیاری کے لیے انہوں نے ایک ٹیوٹر مقرر کیا جو دو سو پچاس روپے معاوضہ لیتا تھا حالانکہ اس وقت ان کی ماہانہ تنخواہ دو سو چالیس روپے تھی۔

مجلسِ ترقیِ ادب کے دفتر میں پروف ریڈنگ کی ایک آسامی خالی تھی جس کے لیے یونس جاوید نے اپنے دوست زاہد فارانی کی سفارش کی۔ زاہد فارانی شاعر و نقاد تھے اور ایم۔اے کی سند رکھتے تھے۔ درخواست میں تعلیمی کوائف کے طور پر صرف میٹرک درج کیا گیا کیونکہ ادارے میں زیادہ تر ملازمین اسی معیار کے حامل تھے۔ اس طرح انہیں ملازمت مل گئی لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ زاہد فارانی اور ادارے کے سربراہ کے درمیان اکثر بحث و تکرار رہتی تھی اور وہ دلائل کے ذریعے اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے تھے جس سے دونوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ بعد ازاں ان کی اصل تعلیمی حیثیت (ایم۔اے ہونا) اور دفتر کے اوقات میں اوپر اپنے کمرے میں غزل لکھنے جیسے معاملات سامنے آئے جن کی بنا پر ان کی ملازمت ختم کر دی گئی۔ مزید یہ کہ انہوں نے اس معروف اصول "Boss is Always Right" کو بھی قبول کرنے سے انکار کیا تھا جو ان کی برطرفی کا ایک اضافی سبب بنا۔

یونس جاوید لکھتے ہیں:

"اس کی تحقیق دفتر والوں نے جانے کہاں سے کی، کہ وہ تو ایم اے ہے۔ یہی اس کا جرم بن گیا۔ پہلے اسے کام زیادہ دے کر دبانے کی کوشش کی گئی ۔۔ پھر ایک روز کسی نے راز کھولا جناب وہ تو اوپر اپنے کمرے میں غزل لکھ رہا تھا یہ دوسرا جرم تھا۔ قصہ مختصر اُسے حکم دیا گیا کہ وہ استعفیٰ لکھ دے۔ کیونکہ اس نے غلط بیانی کی ہے اور وہ دفتر میں بیٹھ کر غزل لکھتا ہوا پایا گیا ہے۔ یہ بات اس قدر بڑھ گئی کہ زاہد فارانی کو استعفیٰ لکھنا پڑا وہ میرے سامنے بیٹھ کر استعفیٰ لکھ رہا تھا اور بے آواز رو بھی رہا تھا۔ میرے دل پر پہاڑ اتنا بوجھ آن گرا تھا کہ وہ بے قصور تھا مگر میں بزدل کیوں تھا۔"(۸)

یوسف قریشی مجلس ترقی ادب کے ہیڈ کلرک تھے جو لاہور کارپوریشن سے ڈیپوٹیشن پر آئے تھے۔ ان کا مشہور مقولہ تھا: "کاغذ پکے کرو اور کھا جاؤ۔" یونس جاوید کو اس دوران بی۔ اے کے امتحان کی تیاری بھی کرنی تھی اور امتحان میں شریک بھی ہونا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یوسف قریشی کی معاونت سے اور ان کے مخصوص فارمولے پر عمل کرتے ہوئے یعنی: "میرے گھوڑے کو پٹھے تو ڈالنا پڑیں گے" کے تحت یہ مؤقف اختیار کیا کہ انہیں گھر کی تعمیر کے لیے ایک ماہ کی رخصت درکار ہے۔ اس بنیاد پر ان کی چھٹی منظور ہو گئی۔ یونس جاوید نے اس دوران بی۔ اے کے امتحان کی بھرپور تیاری کی اور امتحان میں شرکت کے بعد اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ یونس جاوید لکھتے ہیں:

"اس نے درخواست کرنے کے بعد بین السطور مجھے سمجھایا درخواست کی منظوری کے لئے میرے گھوڑے کو پٹھے تو ڈالنا پڑیں گے اس کا مطلب تھا موٹر سائیکل میں پٹرول کی رقم اور بال بچوں کے لئے اعلیٰ نسل کی مٹھائی میں نے سب شرطیں تسلیم کر لیں۔۔۔ یہ پیار محبت کی بات ہے اصل کام ہے نقد۔"(۹)

ریاض پوسٹ مین ڈاک لے کر آیا اور رزلٹ کارڈ دیتے ہوئے خوش خبری سنائی۔ مجلس کے ماحول اور دفتری صورتحال کے باعث وہ اس کامیابی کی خوشی اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ زیادہ نہ بانٹ سکے کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں ان کا انجام بھی زاہد فارانی جیسا نہ ہو اور انہیں ملازمت سے استعفیٰ نہ دینا پڑے۔ اسی دوران ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا کہ ادارے کے سربراہ امتیاز علی تاج کو قتل کر دیا گیا جبکہ ان کی اہلیہ شدید زخمی ہو گئیں۔

امتیاز علی تاج کے قتل کے بعد ادارے کی سربراہی حمید احمد خان کے سپرد ہوئی۔ یونس جاوید نے ان سے ملاقات کر کے پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے باقاعدہ (ریگولر) کرنے کی اجازت طلب کی اور اپنے وقت کی تقسیم بھی تفصیل سے بیان کی

کہ کس طرح وہ مجلس کے فرائض اور یونیورسٹی کی تعلیم کو بیک وقت نبھا سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وقت کی بچت کے لیے وہ موٹر سائیکل خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کافی گفتگو کے بعد حمید احمد خان نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ یہ معاملہ بورڈ آف گورنرز کی میٹنگ میں پیش کیا جائے گا۔ اسی دوران گفتگو کے تسلسل میں انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے یونس جاوید کا افسانوی مجموعہ "تیز ہوا کا شور" پڑھا ہے، خصوصاً اس میں شامل وہ افسانہ جو دیوارِ برلن کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے یونس جاوید اپنے تاثرات کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "پھر کہا "میں نے آپ کی کتاب تیز ہوا کا شور کی دو کہانیاں پڑھی ہیں" پہلی جو دیوار برلن کے بارے میں ہے۔۔۔ اور آخری آپ نے دیوار برلن پر یہ کیسے لکھ لیا؟ میں چپ رہا تو انہوں نے بات بڑھائی، میں دیوار برلن دیکھنے خود اس جگہ گیا تھا میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان عورت روتے ہوئے مڑ مڑ کر مشرقی جرمنی جو اب روس کے قبضے میں ہے کی طرف دیکھتی ہے اور آنسو پونچھتی جاتی ہے۔ بڑا دل گداز منظر تھا۔ اب آپ کی کہانی پڑھی تو ایسی بہت سی باتیں سامنے آئیں۔۔ آپ نے کس طرح یہ بغیر دیکھے پھر انہوں نے بات بدل کر کہا) Power of imagination قوت متخیلہ) بڑی چیز ہے اگر لکھنے والے میں یہ اور حافظہ موجود ہو تو وہ کامران ہوتا ہے۔"(۱۰)

یونس جاوید نے اپنی خودنوشت کے اس حصے میں مجلسِ ترقیِ ادب میں کام کرنے والے ایسے ملازمین کا نقشہ کھینچا ہے جو عمومی طور پر میٹرک تک تعلیم رکھتے تھے اور ادارے کے ماحول میں اس بات کی گنجائش کم تھی کہ کوئی فرد ان سے زیادہ علمی استعداد یا اعلیٰ تعلیم کا حامل ہو کر کام کرے۔ حتیٰ کہ ادارے کے سربراہان بھی جو عموماً اس اصول کے قائل تھے کہ " Boss is always right "اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے کہ کوئی ماتحت اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے یا دلیل کے ساتھ اپنی رائے پیش کرے۔ اس ماحول میں حق اور سچ کا اظہار کرنا عملاً ملازمت سے محرومی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ مزید اس حصے میں یونس جاوید نے کلرکی نظام میں پائی جانے والی بالادستی اور رشوت ستانی کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ یوسف سلیم جیسے بعض کردار رشوت کو ایک معمول اور جواز کے طور پر قبول کر لیتے ہیں اور ان کا بنیادی اصول یہی بن جاتا ہے کہ "کاغذ پکے کرو اور کھاؤ۔" اس طرح یونس جاوید صرف اپنی ذاتی سرگزشت بیان نہیں کرتے بلکہ اسے ایک اجتماعی تجربے کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ معاشرے کے اندر جاری رویّوں، اخلاقی گراوٹ اور ادارہ جاتی بگاڑ کو مسلسل اجاگر کرتے ہوئے قاری کے سامنے ایک حقیقی اور بے پردہ سماجی تصویر رکھتے ہیں۔

''صبحِ انتظار''میں بورڈ آف گورنرز کی میٹنگ کا ذکر کیا گیا ہے جس میں یونس جاوید کی تعلیمی اجازت نامے کی درخواست پیش کی گئی۔ اجلاس کے دوران ایس۔ اے رحمان نے صاف الفاظ میں ''No'' کہہ کر اسے مسترد کر دیا اور دیگر اراکین نے بھی اس فیصلے کے مقابل خاموشی اختیار کی۔ حمید احمد خان نے اس معاملے کو مدلل انداز میں سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کی بات بھی قبول نہ کی گئی۔ اگلی صبح حمید احمد خان نے یونس جاوید کو اپنے دفتر طلب کیا اور انہیں اطلاع دی کہ ان کی درخواست منظور نہیں ہو سکی۔ اس وقت ان کے چہرے پر غصے اور رنج کے آثار نمایاں تھے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ چیئر مین نے اس اجازت کی منظوری نہیں دی اور یہاں تک کہا کہ ان پر نگرانی رکھی جائے تاکہ وہ کہیں ''دیوانِ غالب'' کے مطالعے میں ہی وقت ضائع نہ کرتے رہیں۔ چیئر مین کے بارے میں ان کے خیالات کو یونس جاوید نے اس انداز میں بیان کیا ہے:

> ''مگر چیئر مین ایس اے رحمان۔۔۔ انہوں نے غصے سے دانت کچکچائے اور گرج دار آواز میں کہا''ہر رکن چیئر مین چیئر مین کر رہا تھا۔۔۔ چیئر مین ایس اے رحمان کو انہوں نے چیرمین ماؤزے تنگ سمجھ لیا تھا، شاید۔۔''رک کر کہا۔ شاید نہیں۔۔۔ یقیناً ایس اے رحمان نے خود کو چیئر مین ماؤزے تنگ سمجھ لیا تھا۔ حمید احمد خان نے یونس جاوید کو اُن آفیشل طریقے سے ایم۔ اے کرنے کی اجازت دی۔ قریشی جو اپنے آپ کو مجلس کا مختار کل سمجھتا تھا، اُسے بلا کر وارننگ دی کہ اس معاملے میں کسی کو خبر نہ ہو اور اگر کوئی بات ہوئی تو آپ کو ڈیپوٹیشن اور بقایا جات سے ہاتھ دھونا پڑ سکتا ہے۔ اس ''ان آفیشل''بات کو آپ یونس جاوید میں اور خدا کے درمیان رکھنا ہے ورنہ نتیجہ کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے۔ مس کنڈکٹ بھی لگ سکتا ہے۔ قریشی اس معاملے میں خوف زدہ ہو گیا تھا۔ یونس جاوید صاحب آئندہ سے آٹھ، سوا آٹھ بجے دفتر آئیں گے نو بجے یونیورسٹی کے لئے جائیں گے۔ بارہ بجے واپس آکر۔۔۔ دو بجے کی بجائے پانچ بجے چھٹی کریں گے اور یہ روزانہ کا معمول ہو گا اَن آفیشلی۔ "Between You, me, He and God. Ok."
>
> کوئی مشکل بات تو نہیں کی میں نے؟ نو سر۔''(۱۱)

یونس جاوید نے ''صبحِ انتظار'' میں اداروں کے سربراہان کے مختلف طرزِ عمل کو نمایاں کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک ہی ادارے میں ایسے افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو تعلیم کے فروغ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور ایسے بھی جو اپنے ماتحتوں کی علمی

ترقی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ایک طرف ایس۔ اے رحمان ہیں جنہوں نے ان کی تعلیم جاری رکھنے کی درخواست مسترد کر دی جبکہ دوسری جانب پروفیسر حمید احمد خان ہیں جنہوں نے غیر رسمی طور پر یونس جاوید کو ایم۔ اے اردو میں داخلہ لینے اور اپنی تعلیم جاری رکھنے کی ترغیب دی۔ یہی نہیں انہوں نے ان عناصر کو بھی تنبیہ کی جو اس معاملے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مصنف نے یہ واضح کیا ہے کہ ہر ادارے میں ایسے سربراہ بھی ہوتے ہیں جو اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہمدردانہ اور مشفقانہ رویہ اختیار کرتے ہیں ان کی صلاحیتوں کو سراہتے ہیں اور تعلیمی و پیشہ ورانہ ترقی میں ان کا بھرپور تعاون کرتے ہیں۔

یونس جاوید نے ''سرشاری'' میں یونیورسٹی میں داخلے کے مراحل، امتحان میں کامیابی اور اپنے اساتذہ کے حالات و واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس حصے میں بالخصوص ڈاکٹر عبید اللہ خان کے یونس جاوید کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے رویّے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ داخلے کے عمل، انٹرویو، یونیورسٹی کے ماحول اور اساتذہ کی شخصیات کی جو تصویر کشی یونس جاوید نے کی ہے وہ نہایت اثر انگیز ہے۔ ان کا اندازِ بیان ایسا ہے کہ قاری خود کو ان تمام مناظر کا عینی شاہد محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس سلسلے میں یونس جاوید لکھتے ہیں:

> ''یونیورسٹی اورینٹل کالج میں داخلے کے لئے ایک بہار کا سماں تھا سب لڑکے لڑکیاں ان لمحات کو بھرپور طریقے سے انجوائے کر رہے تھے۔ نئے لوگوں سے تعارف کا اپنا مزہ ہوتا ہے۔ انٹرویو اور اس کے الگ سے لوازمات ۔۔۔ مگر میں سہما ہوا تھا میں نے ریگولر سٹوڈنٹ جیسی زندگی دیکھی ہی نہ تھی۔ دیکھی بھی تو پرائیویٹ رات کے کالجز میں ۔۔۔ میں اس کمرے میں دبک کر انٹرویو کا انتظار کرنے لگا جو اساتذہ کے لئے مخصوص تھا مگر تبسم کاشمیری مہربان ہوئے مجھے یہاں بیٹھنے کا سہارا دے کر خود پرنسپل کے کمرے میں چلے گئے تھے جو بالکل اس کمرے کے بالمقابل تھا۔ پرنسپل عبادت بریلوی صاحب اور دیگر اساتذہ انٹرویو لے رہے تھے میری درخواست منظور ہو چکی تھی اب زبانی امتحان تھا دل، ہر امتحان میں بیٹھنے والی کیفیت میں تھا۔ میں چاہتا تھا جلد یہ مرحلہ طے ہو اور میری پل صراط کا سفر تمام ہو۔''(۱۲)

جب یونس جاوید کو انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا تو کمرے میں عبادت بریلوی اور تبسم کاشمیری موجود تھے۔ اس موقع پر تبسم کاشمیری نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہی یونس جاوید ہیں جن کے افسانوی مجموعے ''تیز ہوا کا شور'' کا

ان دنوں ادبی حلقوں میں خاصا ذکر ہو رہا ہے۔ پھر مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان سے باقاعدہ انٹرویو لینے کی چنداں ضرورت نہیں البتہ اگر کوئی سوال کرنا ہو تو ضرور کر لیا جائے۔

پرنسپل عبادت بریلوی نے اُس وقت جو تاریخی جملے کہے وہ کچھ یوں ہیں:

"یہ ہماری اور اس ادارے کی خوش قسمتی ہے کہ آپ ایسے تخلیق کار، علم اور تہذیب کے لئے یہاں آئے ہیں۔"(۱۳)

یونس جاوید کے افسانوی مجموعہ "تیز ہوا کا شور" کی تقریبِ رونمائی نیشنل بک کونسل کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی جس کے منتظم قاسم محمود تھے۔ اس تقریب میں حفیظ احسن، سجاد باقر رضوی، عزیز الحق اور تبسم کاشمیری نے کتاب پر اپنے مضامین پیش کیے جبکہ صدارت کے فرائض عابد علی عابد نے انجام دیے۔ ان تمام مقالات کو بعد ازاں نیشنل بک کونسل کے ماہنامہ "کتاب" میں شائع کیا گیا۔ یونیورسٹی میں پہلے ہی روز خواجہ زکریا نے طلبہ کے سامنے یونس جاوید کا تعارف کروایا اور ان کے افسانوی مجموعے "تیز ہوا کا شور" پر اظہارِ خیال بھی کیا۔ اس کتاب کا دیباچہ سجاد باقر رضوی نے تحریر کیا جبکہ اس کا سرورق حنیف رامے نے تیار کیا تھا۔ چند ہی دنوں میں طلبہ و طالبات نے اس کتاب کو خرید لیا اور یونس جاوید سے اس پر آٹوگراف بھی حاصل کیے۔

یونس جاوید نے غیر معمولی محنت کے ساتھ دن رات امتحان کی تیاری میں صرف کیے۔ اگرچہ ایم۔اے فائنل کے امتحانات ۱۹۷۲ء میں متوقع تھے لیکن وہ ۱۹۷۳ء میں منعقد ہوئے۔ امتحانات میں انہوں نے بیشتر پرچوں میں نمایاں کارکردگی دکھائی، لیکن خان صاحب نے ساٹھ میں سے صرف تیس نمبر انہیں دیے۔ وہ طنزیہ انداز میں یونس جاوید کو "مزاروں پر حاضری دینے والا" کہا کرتے تھے۔ اس سے ان کی مراد تبسم کاشمیری، خواجہ زکریا، سجاد باقر رضوی اور ڈاکٹر سہیل احمد خان جیسے اساتذہ اور اہلِ علم سے یونس جاوید کی علمی وابستگی تھی۔

یونس جاوید کی شادی ان کی فرسٹ کزن نرگس سے طے ہوگئی جو ڈاکٹر عبیداللہ خان کی شاگرد تھیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر عبیداللہ خان خود ان کے گھر گئے اور نرگس کے اہلِ خانہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ یونس جاوید مناسب شخصیت نہیں اس لیے ان سے شادی نہ کی جائے۔ دوسری طرف امتحانی نتائج کے سلسلے میں منیر حمدانی نے ایک وفد کے ساتھ پرنسپل سے ملاقات کی اور یہ تجویز پیش کی کہ تمام طلبہ کو پانچ، پانچ اضافی نمبر دیے جائیں، لیکن یونس جاوید کو اس رعایت میں شامل نہ کیا جائے۔ اس معاملے پر خاصی کشیدگی اور ہنگامہ آرائی ہوئی۔ ادھر وحید قریشی کی خواہش تھی کہ منیر حمدانی پہلی پوزیشن حاصل کریں، لیکن جب نتائج کا اعلان ہوا تو یونس جاوید نے پورے پنجاب میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ یہ خبر

سن کر پروفیسر حمید احمد خان نے نہ صرف انہیں گلے لگا کر مبارک باد دی بلکہ خوشی کے اظہار کے طور پر متعدد کتابیں بھی بطور تحفہ پیش کیں۔

یونس جاوید لکھتے ہیں کہ حمید احمد خان نے کہا:

> "مجھے معلوم ہوا ہے جس شخص کو ٹاپ کرایا گیا ہے وہ تو واجبی سا طالب علم بھی نہ تھا۔ یونس جاوید صاحب۔ میں وائس چانسلر رہا ہوں۔ جانتا ہوں پہلی پوزیشن کے لئے کیا کیا جتن کیے جاتے ہیں۔ سماجی، سیاسی اور گروہی سطح پر بہر حال آپ کو مبارک ہو۔ وہ برآمدے سے اندر اپنے کمرے میں چلے گئے تو میرے آنسو نکل آئے ان کی عقیدت میں یا خوشی سے، یا پھر صعوبتوں کے سنگلاخ سفر کے اختتام پر یا شاید اپنے لہو لہو پاؤں دیکھ کر۔۔۔ مگر ابھی اختتام کہاں تھا ابھی تو مجھے ڈاکٹریٹ کرنا تھی۔ اس کے لئے بھی زیادہ رہنمائی اور اصرار خواجہ محمد زکریا کی طرف سے تھا اور وہی میرے نگران بھی تھے۔" (۱۴)

یونس جاوید نے آپ بیتی کے حصہ "سرشاری" میں اورینٹل کالج کے علمی ماحول، اساتذہ کے باہمی تعلقات اور گروہ بندی کو نمایاں کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ انہیں تبسم کاشمیری، خواجہ محمد زکریا، سجاد باقر رضوی، وحید قریشی اور ڈاکٹر عبید اللہ خان جیسے ممتاز اساتذہ سے استفادہ کرنے کا موقع ملا لیکن ڈاکٹر عبید اللہ خان کے دیگر اساتذہ کے ساتھ اختلافات بھی نمایاں تھے۔ ان کے بقول، ڈاکٹر عبید اللہ خان ان طلبہ پر طنز کرتے تھے جو دوسرے اساتذہ کے قریب سمجھے جاتے تھے اور وہ انہیں مزاروں پر حاضری دینے والا کہہ کر مخاطب کرتے تھے جسے مصنف اساتذہ کے باہمی رقابت اور حسد کی علامت قرار دیتے ہیں۔ ان اختلافات کا سب سے زیادہ نقصان طلبہ کو اٹھانا پڑتا۔

یونس جاوید کی تحریر یہ یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ تعلیمی نظام میں بعض اوقات میرٹ کے بجائے ذاتی پسند و ناپسند، گروہی وابستگی، خوشامد اور باہمی تعلقات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ان کے مطابق پسندیدہ طلبہ کو نمایاں پوزیشنیں دلانے اور ناپسندیدہ طلبہ کے نمبر کم کرنے جیسے رویے بھی اسی ماحول کا حصہ تھے۔ وہ اپنے ذاتی تجربے کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر عبید اللہ خان کی جانب سے ساٹھ میں سے تیس نمبر دیے جانا اور منیر حمدانی کو پہلی پوزیشن دلانے کی کوششیں اس گروہی طرزِ فکر کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس طرح مصنف اپنے مشاہدات کی بنیاد پر اس تعلیمی نظام میں موجود بعض ناانصافیوں اور غیر میرٹ پر مبنی رجحانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

"پسِ دیوارِ زنداں" میں یونس جاوید نے اپنے پی ایچ ڈی کے سفر اور ڈگری کے حصول کے بعد پیش آنے والے بعض ادبی و علمی تجربات، خصوصاً احمد ندیم قاسمی اور منصورہ حبیب کے رویّوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی سے انہیں ایک تحقیقی خاکہ موصول ہوا جس کا عنوان "حلقۂ اربابِ ذوق" تھا۔ ان کے مطابق اس موضوع پر تیار کیا گیا خاکہ ان کے ایم۔اے کے مقالے سے بڑی حد تک مماثلت رکھتا تھا۔ شعبے کے چیئر مین کے اصرار پر انہوں نے یہ بات جوں کی توں ان کے سامنے بیان کر دی۔ اس پر خواجہ زکریا نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ خود "حلقۂ اربابِ ذوق: تنظیم، تحریک، نظریہ" کے عنوان پر باقاعدہ تحقیق کریں۔ یونس جاوید نے ان کے مشورے کو قبول کیا اور پوری محنت، لگن اور جانفشانی کے ساتھ اپنی تحقیق مکمل کرتے ہوئے پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کیا۔ ان کو جب پی ایچ ڈی کا نوٹیفکیشن ملا تو انہوں نے پورے سٹاف اور خصوصاً احمد ندیم قاسمی صاحب کے لئے، جو حمید احمد خان کے بعد ادارہ کے سربراہ تھے، کیک منگوایا۔ جب کیک پیش کیا گیا تو وہاں دو تین آدمیوں کے علاوہ منصورہ حبیب جو کہ اب منصورہ احمد کہلواتی تھیں براجمان تھیں۔ شروع میں تو وہ برقع میں آتی تھیں لیکن بعد میں ان کا برقع اُتر گیا۔ قاسمی صاحب اور منصورہ نے پوچھا کہ یہ کیک کس سلسلے میں ہے تو یونس جاوید نے نوٹیفکیشن آگے بڑھا دیا۔ پاس بیٹھے لوگوں نے پوچھنے پر بتایا کہ پی ایچ ڈی کا ہنگامہ ہے۔ اس حوالے سے یونس جاوید لکھتے ہیں:

> "ایسے میں انصاف کی امید رکھنا ڈوبتے سورج سے تمازت اور روشنی رکھنے کے مترادف تھا۔ ممکن نہ تھا میرا خیال تھا PHD پر قاسمی صاحب میری پذیرائی کرتے ہوئے ضرور گلے لگائیں گے۔ شاباش دیں گے اور ہمیشہ کی طرح بیل بجا کر عبدالکریم سے کہیں گے یونس جاوید صاحب کے لئے چائے لاؤ کیونکہ چائے کا ہنگامہ پہلے سے چل رہا تھا اور قاسمی صاحب عزت اور توقیر کے مجھے چائے کی محفل میں شریک کر لیا کرتے تھے۔"(۱۵)

یونس جاوید نے اس حصے میں پی ایچ ڈی میں داخلے سے لے کر ڈگری کے نوٹیفکیشن تک کے مراحل بیان کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ احمد ندیم قاسمی کے رویّے میں آنے والی تبدیلی کا بھی ذکر کرتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ پی ایچ ڈی کے نوٹیفکیشن کے بعد ان کا طرزِ عمل پہلے جیسا نہیں رہا۔ وہ احمد ندیم قاسمی اور منصورہ حبیب کی آرا اور مؤقف کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے، حتیٰ کہ ان کے مطابق منصورہ حبیب نے اپنا نام منصورہ احمد رکھ لیا تھا۔ یونس جاوید مزید لکھتے ہیں کہ منصورہ حبیب نے پروین شاکر کے ساتھ بھی سخت رویہ اختیار کیا اور انہیں تنقید اور بے اعتنائی کا نشانہ بنایا۔ ان واقعات کی بنیاد پر مصنف بعض شخصی تعلقات اور ادبی حلقوں کے باہمی اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یوں وہ احمد ندیم قاسمی کے کردار اور طرزِ عمل کے حوالے سے ایسے سوالات اٹھاتے ہیں جو قاری کو ان دعووں اور مشاہدات پر مزید غور و فکر اور تحقیق کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

یونس جاوید نے ''پُل صراط'' میں مجلس ترقیِ ادب، لاہور میں پیش آنے والے مختلف واقعات، اپنی ملازمت کو برقرار رکھنے کی جدوجہد، احمد ندیم قاسمی اور منصورہ احمد کے رویّے، پی ایچ ڈی الاؤنس کے مسئلے، مجلس کے مالی معاملات، اپنی ترقی اور جمیلہ ہاشمی کی وفات جیسے موضوعات کو بیان کیا ہے۔ اس حصے کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے ادبی حلقوں اور ان سے وابستہ شخصیات کے حالات وواقعات کو بھی خاصی وسعت سے قلم بند کیا ہے۔ خصوصاً مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور کے داخلی ماحول، وہاں ہونے والی سرگرمیوں، باہمی تعلقات، انتظامی طرزِ عمل اور مختلف شخصیات کے کردار سے متعلق متعدد پہلو سامنے آتے ہیں۔ اسی تناظر میں احمد ندیم قاسمی کی ترجیحات، منصورہ احمد کے اثر ورسوخ اور مجلس میں پروین شاکر کی حیثیت کے بارے میں بھی مصنف اپنے مشاہدات پیش کرتے ہیں۔ مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے یونس جاوید نے عامر سہیل کو ایک انٹرویو میں کہا:

> ''میں نے مجلس کو ۱۹۶۴ء میں جوائن کیا تھا اُس وقت ناظم امتیاز علی تاج صاحب تھے مگر جب انہیں قتل کر دیا گیا تو حمید احمد خان صاحب ناظم بنے اس کے بعد احمد ندیم قاسمی صاحب آ گئے۔ میں نے تین نظام دیکھے ہیں۔ اس لحاظ سے میں سب سے زیادہ سینئر ہوں۔ میں میٹرک کر کے اس ادارے میں گیا تھا اور پی ایچ ڈی کے مراحل یہیں رہ کر مکمل کیے ہیں۔ تقریباً چالیس سال اور ایک ماہ کا عرصہ میں وہاں رہا ہوں۔''(۱۶)

یونس جاوید کے بیان کے مطابق، پروین شاکر اردو ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتی تھیں، لیکن ان کے بقول منصورہ احمد کے لیے یہ بات قابلِ قبول نہ تھی کہ کسی دوسری شاعرہ کو ان سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ احمد ندیم قاسمی جب کسی مہمان سے منصورہ احمد کا تعارف کراتے تو انہیں موجودہ دور کی ممتاز شاعرہ قرار دیتے۔ ایک موقع پر چند طالبات احمد ندیم قاسمی سے ملاقات کے لیے آئیں۔ انہوں نے ان کا تعارف منصورہ احمد سے کروایا اور ان کی شاعری کی تعریف بھی کی۔ اسی دوران پروین شاکر وہاں پہنچ گئیں تو وہ طالبات منصورہ احمد سے ہٹ کر پروین شاکر کے گرد جمع ہو گئیں۔ بعد ازاں جب پروین شاکر واپس روانہ ہوئیں تو وہ طالبات انہیں رخصت کرنے گئیں اور پھر وہیں سے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔

یونس جاوید کے مطابق اس واقعے سے منصورہ احمد سخت ناخوش ہوئیں اور انہوں نے احمد ندیم قاسمی سے مطالبہ کیا کہ پروین شاکر کو خط لکھ کر ان سے معذرت کرنے کا کہا جائے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ احمد ندیم قاسمی نے ابتدا میں انہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کے اصرار کے باعث بالآخر انہیں خط تحریر کرنا پڑا۔

یونس جاوید اس واقعہ کو یوں رقم کرتے ہیں:

"وہ اُٹھ کھڑی ہو گئی، میں جاؤں گی تو ہمیشہ کے لئے جاؤں گی۔ قاسمی صاحب بھی کھڑے ہو گئے۔ میں خط لکھے دیتا ہوں تم بیٹھو تو۔۔۔ میں بیٹھ گئی تو میرا دل بیٹھ جائے گا بابا۔ وہ ذرا سا نم ہو کر بولی میرا علاج ہے فوری خط۔ قاسمی صاحب نے زور دے کر اسے کندھے سے دبایا اور کرسی پر بٹھا دیا اور خود بھی قریبی کرسی پر اس کے برابر بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی انہیں خیال آیا کہ یونس بھی اسی کمرے میں موجود ہے۔ انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا یونس جاوید صاحب کیا سوچتے ہوں گے۔۔۔ مجھے تو اب یہ بھی یاد نہیں رہا کہ انہیں کس سلسلے میں بلایا تھا۔"(۱۷)

ایک روز فرزانہ بھٹہ کا اچانک فون آیا جسے یونس جاوید نے سنا۔ تعارف کے بعد انہوں نے مجلسِ ترقی اردو کے معاملات کے بارے میں دریافت کیا۔ یونس جاوید نے ان کے سوالات کے جوابات دینے کے ساتھ ساتھ ادارے کے لیے اپنی خدمات سے بھی آگاہ کیا۔ اسی روز وہ پروین ملک سے ملاقات کے لیے گئے جہاں فرزانہ قریشی بھی موجود تھیں جو ایڈیشنل سیکرٹری انفارمیشن منصور سہیل سے واقفیت رکھتی تھیں۔ یونس جاوید نے فون پر ہونے والی پوری گفتگو انہیں بتائی جس پر فرزانہ قریشی نے معاملے کی حقیقت معلوم کرنے کا وعدہ کیا۔ اگلے دن پاک ٹی ہاؤس میں یونس جاوید کی ملاقات نومی سے ہوئی جو انہیں دوبارہ پروین ملک کے گھر لے گیا۔ وہاں پروین ملک نے انہیں آگاہ کیا کہ ان کی ملازمت خطرے میں ہے اور فرزانہ قریشی نے اگلے روز سہیل احمد سے ان کی ملاقات کا وقت طے کر لیا ہے۔ انہوں نے یونس جاوید کو ہدایت کی کہ ملاقات کے دوران جو بھی سوال کیا جائے اس کا سچا جواب دیا جائے۔ چنانچہ اگلے ہی روز یونس جاوید سہیل احمد سے ملنے پہنچے اور ان کے تمام سوالات کے جوابات پوری دیانت داری سے دیے۔ اس واقعے کے بارے میں یونس جاوید لکھتے ہیں:

"میں نے بتانا شروع کر دیا، میں نے کہا سر مجلس کی بہت سی گرانٹ اگر نجی اور ذاتی معاملات میں خرچ نہ کی جاتی تو بہت سے فنڈ بچائے جا سکتے ہیں۔ میں سانس لینے کو رُکا، پھر ہمت کر کے بولا۔ سر، ہمارے دفتر میں ایک خاتون ہے۔ منصورہ حبیب جس نے اپنا نام بدل کر منصورہ احمد رکھ لیا ہے۔ اس کا ایک مکتبہ اساطیر بھی ہے جس کے گاڑی، ڈرائیور، پٹرول، مینٹی ننس اور تقریباً سب ہی ملازمین ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں، اسی مکتبہ کا کام کرتے ہیں جو مجلس ترقی ادب میں خلوص کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے وہی معتوب ٹھہرتا ہے۔ آپ گاڑی کا پٹرول اور دیکھ بھال کے اخراجات کا ریکارڈ منگوا کر دیکھ لیں۔ لگ بھگ آدھی گرانٹ اسی پر

> خرچ ہوتی ہے۔ میں نے جزئیات میں بہت سی باتیں ان کے گوش گزار اس لئے کر دی تھیں کہ یہ سچ اور جھوٹ کی جنگ تھی۔۔۔ یہ زندگی اور موت کا مرحلہ تھا۔۔۔ ان میں بہت سے حسد کے باعث چاہتے ہیں کہ مجھے فارغ کر دیا جائے۔۔۔ خصوصاً منصورہ حبیب، جو دفتر میں ملازم نہیں ہیں، مگر ناظم صاحب کی چیئر پر بیٹھ کر احکامات جاری کرتی ہیں۔۔۔ سو میں زیر عتاب ہوں۔"(۱۸)

سہیل احمد سے یونس جاوید کی ملاقات کے بعد انہیں پورا معاملہ واضح طور پر سمجھ آ گیا اور ان کی پریشانی وقتی طور پر دور ہو گئی۔ ایک دن وہ کمرے میں داخل ہوئے تو قاسمی صاحب خوش دکھائی دے رہے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ایک غیر ضروری فرد کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ منصورہ بھی اس پر مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ جب یونس جاوید نے فون پر تصدیق کی تو معلوم ہوا کہ ٹرانسفر نہیں ہوا بلکہ انہیں میوزیم میں اضافی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ یہ حقیقت جب احمد ندیم قاسمی اور منصورہ تک پہنچی تو دونوں کے تاثرات بدل گئے۔

اسی سلسلے میں ایک اور واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے یونس جاوید لکھتے ہیں کہ منصورہ احمد نے ایک موقع پر حکومتی نظام کے خلاف گورنر کے سامنے نظم پیش کی تھی جس پر احمد ندیم قاسمی نے ان کے لیے رسالہ "فنون" میں ایک سو ستر صفحات مخصوص کیے۔ اسی طرح ان کی کتاب "طلوع" کے لیے اسلوب احمد انصاری سے لے کر اعتبار ساجد تک مختلف اہلِ قلم سے فلیپ تحریر کروائے گئے۔ منصورہ احمد کی ذہنی کیفیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک موقع پر جب احمد ندیم قاسمی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں قطر ایوارڈ دیا گیا جس پر سونے کا ملمع کیا گیا تھا تو انہوں نے اسے اصل سونا سمجھ کر توڑ موڑ کر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ بعد ازاں جب وہ اسے فروخت کرنے سنار کے پاس گئیں تو معلوم ہوا کہ وہ خالص سونا نہیں بلکہ محض سونے کا پانی چڑھا ہوا اعزاز تھا۔

بورڈ آف گورنرز نے یونس جاوید کے لیے اگلے گریڈ ۱۹ کی سفارش کی اور ساتھ ہی ان کے لیے ٹیلی فون کی منظوری بھی دے دی۔ اگرچہ ٹیلی فون کی تنصیب ایک مشکل مرحلہ تھا، لیکن بعد ازاں محترمہ بے نظیر بھٹو کے پریس سیکرٹری نے جب یونس جاوید سے ان کے پیشے کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ ایڈیٹر آف بکس اور ایڈیٹر "صحیفہ" ہیں۔ اس موقع پر انہوں نے بے روزگار ادیبوں کی حالتِ زار بہتر بنانے کی بھی درخواست کی اور ٹیلی فون کے التوا کا ذکر کرتے ہوئے اس کے جلد اجرا کی گزارش کی۔ تقریباً بائیس دن بعد پی پی حکومت ختم ہو گئی، لیکن یونس جاوید کے ٹیلی فون کا مسئلہ حل ہو گیا۔ بعد ازاں یہ فون قاسمی صاحب کے کمرے میں نصب کیا گیا اور پھر وہاں سے یونس جاوید کے کمرے میں

منتقل کر دیا گیا۔ تاہم فون کی نگرانی کا ایسا بندوبست کیا گیا جس کے ذریعے احمد ندیم قاسمی اور منصورہ احمد ان کی ٹیلی فونک گفتگو سنتے رہتے تھے۔ اس کا علم یونس جاوید کو بعد میں ہوا جس کا انہیں شدید رنج ہوا۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

"ایک روز انسٹیٹیوٹ آف اسلامک کلچر کے ایک ملازم نے جو ہمارے بورڈ آف گورنرز کے ہاں ایک رُکن کا عزیز بھی تھا۔ اچانک کسی کو مطلع کر دیا کہ اسے اسلام آباد میں بہت اعلیٰ درجے کی جاب مل گئی تھی جو اٹامک انرجی کے محکمے میں تھی۔ اس محسن کا نام تک مجھے نہیں معلوم۔ انہوں نے کسی کے توسط سے اپنے عزیز رکن تک یہ خبر پہنچائی کہ میں فون پر احتیاط کروں نیچے اس فون کی تاروں میں اس طرح ردوبدل کر لیا گیا ہے کہ آپ کی گفتگو سُنی جا سکے۔ یہ جان کر میرا سارا لہو بل کر رہ گیا۔ میں ایسی کونسی گفتگو کرتا تھا جسے خصوصاً سُنا جاتا۔ خصوصاً منصورہ کا الزام تھا کہ میں بابا کے دشمنوں خصوصاً انور سدید سے رابطہ رکھتا ہوں، اس طرح کی بے اعتباری سے مجھے شدید دھچکا لگا۔"(۱۹)

یونس جاوید نے اس واقعہ کے تحت اپنی کہانی "زوال" تحریر کی جسے بعد میں انہوں نے عطاء الحق قاسمی کے ذریعے رسالہ "معاصر" میں شائع کرانے کی درخواست کی۔ عطاء الحق قاسمی نے اسے خوش دلی سے شائع بھی کر دیا۔ یونس جاوید کے مطابق ان کی عطاء الحق قاسمی سے دوستی اس دور سے تھی جب صدر ایوب کے خلاف سیاسی تحریک جاری تھی۔ اسی تناظر میں انہوں نے ٹیلی فون پر گفتگو سننے جیسے غیر اخلاقی رویے کا ذکر بھی عطاء الحق قاسمی سے کیا جس پر وہ سخت افسردہ ہوئے۔ یونس جاوید اس ماحول کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ متعدد ادیبوں اور شاعروں کی عزتِ نفس کو مجروح کیا گیا اور کوئی ایسا شخص کم ہی ہو گا جس نے اس طرزِ عمل کا براہِ راست یا بالواسطہ تجربہ نہ کیا ہو۔ حتیٰ کہ ان کے مطابق احمد ندیم قاسمی بھی بعض مواقع پر متعلقہ خاتون کی سخت ترین زیادتیوں اور ناگوار رویّوں کو حتیٰ کہ بدزبانی تک کو، نظر انداز کر دیتے تھے۔ اسی طرح خالد احمد کو اسٹیج پر بلانے اور اعجاز احمد رضوی کی تضحیک جیسے واقعات بھی اسی سلسلے کی کڑیاں قرار دی جاتی ہیں۔ یونس جاوید اس پورے پس منظر کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"منصورہ نے رضوی کو بے عزت کرنا شروع کر دیا کہ تم نے خالد احمد کو سٹیج پر کیوں بلایا۔ جانتے ہوئے بھی کہ میں اُس سے ناراض ہوں حتیٰ کہ اس نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اس کا حوصلہ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ اس نے

بار بار رضوی کو باسٹر ڈ کہنا شروع کر دیا۔ اعجاز رضوی خون کے گھونٹ پی کر
رہ گیا۔"(۲۰)

یونس جاوید کے مطابق اعجاز رضوی منصورہ حبیب کے لیے فروٹ چاٹ اور دہی بھلے تیار کروا کر لایا کرتا تھا۔ وہ نہایت تابعدار، خاموش مزاج اور خوش طبع انسان تھا جو دفتر میں ہر ایک کے ساتھ احترام اور شائستگی سے پیش آتا تھا اور دفتر کے لوگ بھی ان کے حسنِ سلوک کی قدر کرتے تھے۔ وہ دل گرفتہ ہو کر اپنی شکایت لے کر احمد ندیم قاسمی کے پاس گیا کہ منصورہ حبیب نے انہیں "باسٹرڈ" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

یونس جاوید نے آپ بیتی کے اس حصے میں صرف منصورہ احمد کے رویّے ہی کو نہیں بلکہ احمد ندیم قاسمی کے طرزِ عمل کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔ وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کس حد تک احمد ندیم قاسمی منصورہ احمد کے زیر اثر تھے۔ یہاں تک کہ ایک بڑے ادبی قد کے حامل ہونے کے باوجود بعض مواقع پر اخلاقی اور پیشہ ورانہ حدود متاثر ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ منصورہ احمد انہیں "بابا" کہہ کر مخاطب کرتی تھیں اور ساتھ ہی ان پر خاصا اثر و رسوخ بھی رکھتی تھیں جس کے نتیجے میں احمد ندیم قاسمی ان کے ہر اچھے بُرے فیصلے کو قبول کرتے دکھائی دیتے تھے۔

یونس جاوید لکھتے ہیں:

"بعد میں معلوم ہوا کہ دُکھی ہو کر فریادی نے قاسمی صاحب کو آکر جب
یہ بتایا کہ سر جی، بی بی نے مجھے گالیاں بھی دیں ہیں۔ بے عزت بھی کیا ہے
اور بار بار باسٹر ڈ بھی کہا ہے۔ میں سید ہوں سر، اس لئے میں اپنا احترام خود
بھی کرتا ہوں، کہتے کہتے وہ تقریباً رو پڑا تھا اس کا خیال تھا قاسمی صاحب
منصورہ کو (مصنوعی ہی سہی) ڈانٹ دیں گے اور صلح کرا دیں گے مگر انہوں
نے بڑی حیرت اور یقین سے کہا اچھا۔۔۔؟ اگر اس (منصورہ کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے) نے باسٹر ڈ کہا ہے تو تم سو فیصد باسٹر ڈ ہو۔"(۲۱)

ایک موقع پر مشاعرے کے دوران احمد ندیم قاسمی کے خلاف ہنگامہ آرائی ہوئی تو یونس جاوید نے صورتِ حال کو سنبھالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی حصے میں وہ امتیاز علی تاج کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ انہیں اردو تھیٹریکل ڈراموں کی تیس جلدوں کو مرتب کرنے کا خاص جنون تھا۔ وہ اس منصوبے پر بڑی حد تک کام مکمل کر چکے تھے لیکن ابتدائی ڈرامہ "خورشید" دستیاب نہیں ہو رہا تھا۔ بعد ازاں لکھنؤ سے نائب حسین نقوی وہ مسودہ لے کر آئے تو امتیاز علی تاج کی خوشی قابلِ دید تھی۔ ان کی کیفیت ایسی تھی جیسے انہیں کوئی کھویا ہوا بچہ مل گیا ہو۔

یونس جاوید نے جریدہ "صحیفہ" کی ادارت اکتیس (۳۱) برس تک سر انجام دی۔ ابتدا میں اس جریدے میں محدود انتخاب کے تحت صرف چار کہانیاں، چار غزلیں، چار نظمیں، چار منتخب مضامین، چار تبصرے اور دیگر زبانوں سے ترجمہ شدہ مواد شائع کیا جاتا تھا۔ اسی انتخابی معیار اور متنوع مواد کی بدولت "صحیفہ" کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، یہاں تک کہ قارئین اس کے نئے شمارے کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ "صحیفہ" کا جدید دور ۱۹۷۷ء سے شروع ہوا اور محض چار برس کے اندر اسے ایک مستند ادبی جریدے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کا مجموعی حجم تقریباً ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ "صحیفہ" کی بنیاد ۱۹۵۸ء میں رکھی گئی تھی۔ اس جریدے کے بارے میں پرتو روہیلہ لکھتے ہیں:

"صحیفہ کی نسبت میرا تجربہ کچھ اچھا نہ تھا، سابقہ تجربے کے برخلاف، صحیفہ کے تازے شمارے نے (مجھے) حیرت میں ڈال دیا۔ صحیفہ کے ارباب اختیار لائق توصیف ہیں۔"(۲۲)

یونس جاوید نے اپنی آپ بیتی میں احمد ندیم قاسمی کے خطوط کا بھی تذکرہ کیا ہے جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رسائل و جرائد کے مدیران کو کس نوعیت کے خطوط ارسال کرتے تھے اور ان میں ان کا اسلوب کس حد تک خوشامدانہ اور رسمی نوعیت کا ہوتا تھا۔ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"ابھی ابھی ہمایوں مارچ نمبر ملا۔ بزم ہمایوں میں ایک شاعر کی حیثیت سے آپ دیر کے بعد جلوہ گر ہوتے ہیں لیکن جب جلوہ گر ہوتے ہیں تو ساری بزم پر چھا جاتے ہیں۔

جنوں پنہاں، جنوں ظاہر، جنوں اول، جنوں آخر

اسی اک طرف سے پیدا میں سو افسانہ کرتا ہوں

بلاتی ہے زمین و آسمان کو خودسری میری

گزاں خود فطرت خلاق کے دل پر گزرتا ہوں

خدا کی قسم یہ اشعار اردو زبان کا غیر فانی سرمایہ ہیں۔ صبح نو بجے مجھے پرچہ ملا اور اب ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔ میں نے ہمایوں کی فہرست مضامین اور آپ کی اس نظم کے سوا کچھ نہیں پڑھا۔"(۲۳)

یونس جاوید نے اپنی آپ بیتی میں احمد ندیم قاسمی کے معاشقوں اور نجی معاملات کو بھی بیان کیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے انتقال پر وہ کس طرح وہاں پہنچے، کون کون سے ادیب اُن کے جنازے میں شامل ہوئے اور منصورہ کس طرح بن ٹھن کر غمی کے اس موقع پر گئی، اس ساری بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یونس جاوید اس خاتون سے خوب نفرت کرتے تھے اور ان پر کیچڑ اچھالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ یقیناً یہ اس رویے کا ردِعمل تھا جو منصورہ نے یونس جاوید کے ساتھ روا رکھا ہوا تھا۔ مصنف نے احمد ندیم قاسمی کے استعفے کے واقعے کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں چوہدری پرویز الٰہی، جو اس وقت وزیر اعلیٰ تھے، کو یہ بات بھی پہنچائی گئی کہ احمد ندیم قاسمی کو ادارے میں کام کرنے نہیں دیا جا رہا اور اس کی بڑی وجہ یونس جاوید ہیں۔ اسی طرح مجیب الرحمٰن شامی نے بھی یہی مؤقف وزیر اعلیٰ کے سامنے پیش کیا اور درخواست کی کہ احمد ندیم قاسمی کو دوبارہ ناظم کے منصب پر بحال کیا جائے۔ یونس جاوید ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''جب یہ استعفیٰ دیتے ہیں تو ایک مہینہ لیتے ہیں اسی دوران تمام دوستوں اور کالمسٹوں کو خط لکھتے ہیں، کالم لکھواتے ہیں، اپنے حق میں Campaign چلاتے ہیں، پھر جب استعفیٰ واپس کرانے کے لئے گئے تو اُن کا کام مجیب الرحمن شامی صاحب نے کیا انہوں نے جاکر وزیر اعلیٰ سے درخواست کی، انہوں نے کہا کہ استعفیٰ تو واپس نہیں ہو سکتا ہم قاسمی صاحب کو تین سال کا ایگریمنٹ اور دے دیتے ہیں۔۔۔ اچانک منصورہ احمد کا فون آیا انہوں نے گالی دے کر کہا کہ کمرہ خالی کر دو ہم آ رہے ہیں۔''(۲۴)

اپنی آپ بیتی میں یونس جاوید ایک طرف تو اپنے بقایاجات کا ذکر کرتے ہوئے یہ مؤقف پیش کرتے ہیں کہ ان کی تنخواہ دگنی ہو چکی تھی لیکن عملی طور پر انہیں صرف ۶۲۰۰ روپے ہی موصول ہوتے رہے۔ دوسری طرف وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ دوستوں کے مشورے کے باوجود انہوں نے عدالت سے رجوع نہیں کیا اور خود کو ایک صابر، شاکر اور قانع مزاج شخص کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس سے ان کے بیانیے میں ایک تضاد کا تاثر ابھرتا ہے۔

یونس جاوید بعض مسودات کے ضائع ہونے، کتابوں کی عدم دستیابی اور دیگر سامان سے متعلق مسائل کا ذمہ دار احمد ندیم قاسمی کو قرار دیتے ہیں جبکہ اپنے بیانیے میں وہ خود کو ایک صاف گو اور اصول پسند شخص کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اسی دوران اکیڈمی آف لیٹرز کی مدیرہ سعیدہ درانی نے انہیں فون کر کے ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کی تلخیص تیار کرنے کی درخواست کی جسے انہوں نے مکمل کر دیا۔ بعد ازاں ان کا تبادلہ ہو گیا اور ان کی جگہ فخر زمان آ گئے جنہوں نے اس اشاعت سے انکار کر دیا۔ اسی عرصے میں زاہد حسین نے اے ٹی وی کے لیے ڈرامہ لکھنے کی درخواست کی جسے یونس جاوید نے قبول کیا اور اس کام کے لیے اپنے دفتر کا کمرہ بھی مہیا کر دیا تاکہ وہ پر سکون ماحول میں لکھ سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ نیشنل کالج آف آرٹس

کی جانب سے وجیہہ رضا نے انہیں بچوں کو ڈراموں سے متعلق لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا جسے انہوں نے قبول کرتے ہوئے وہاں پڑھانا شروع کر دیا۔ بعد ازاں اجمل نیازی کے ایک کالم میں یہ بات سامنے آئی کہ یونس جاوید کو مجلس ترقی ادب میں کلرک کے طور پر رکھا گیا ہے۔ اس خبر پر احمد ندیم قاسمی نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنے خلاف منفی پروپیگنڈا اور یونس جاوید کی ملی بھگت قرار دیا۔ اس حوالے سے یونس جاوید لکھتے ہیں:

"کچھ کہنے کی ضرورت ہے نہ کسی صفائی کی۔۔ صرف میری بات سنیں۔
آپ کے مشورے اور ہدایات کے بغیر اجمل کیسے لکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ
کمینہ پن کی بدترین مثال ہے جو آپ دونوں کی ملی بھگت سے وجود میں آئی
ہے۔"(۲۵)

یونس جاوید نے اس حصے میں احمد ندیم قاسمی اور منصورہ احمد کے ذکر کے ساتھ ساتھ مجلسِ ترقیِ ادب کے ماحول اور وہاں پیش آنے والے واقعات کو نسبتاً تفصیل سے رقم کیا ہے۔ وہ مختلف مواقع پر اپنی ملازمت کو متاثر کرنے والی صورتِ حال، فون کی خفیہ نگرانی، ادارہ جاتی معاملات پر چیک اینڈ بیلنس اور منصورہ احمد کے مبینہ طور پر دائرۂ اختیار سے ہٹ کر اثر و رسوخ استعمال کرنے جیسے امور کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی تناظر میں وہ مجلس کے بعض ملازمین کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویّوں اور ادارے کے اندرونی انتظامی مسائل کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ یونس جاوید کی تحریر میں بعض مقامات پر احمد ندیم قاسمی اور منصورہ احمد کے حوالے سے تنقیدی انداز بھی نمایاں ہوتا ہے جس میں خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر سمیت بعض دیگر ادبی شخصیات کے حوالے بھی زیرِ بحث آتے ہیں۔ وہ مجلس کے مالی و انتظامی معاملات اور فنڈز کے استعمال سے متعلق بھی سوالات اٹھاتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس حصے میں ان کا بیانیہ ذاتی تجربات، مشاہدات اور تنقیدی رائے کا امتزاج پیش کرتا ہے، جس میں کبھی ہمدردانہ اور کبھی سخت تنقیدی لہجہ محسوس ہوتا ہے۔ یونس جاوید آپ بیتی کے اس حصے میں خود کو بے قصور اور مسلسل دفاعی پوزیشن میں دکھاتے ہیں جبکہ کم ہی جگہوں پر اپنی کسی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس بیانیے سے البتہ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور کے اندرونی ماحول اور اس کے انتظامی و سماجی حالات کی جھلک واضح ہو جاتی ہے۔

کتاب کا آخری باب "چراغِ آخرِ شب" کے عنوان سے ہے جس میں ادارے کے پرانے ملازم بابا عبدالکریم کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اس وقت سے ادارے سے وابستہ تھے جب اس کا نام ٹرانسلیشن بورڈ تھا (قیام ۱۹۵۰ء)، جو بعد میں ۱۹۵۸ء میں مجلسِ ترقیِ ادب لاہور کہلایا۔ اس ادارے کے لیے قواعد و ضوابط اور بورڈ آف گورنرز بھی تشکیل دیے گئے جن میں خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر ایم ایم شریف اور ایس ایم اکرام جیسے نام شامل تھے۔ مصنف کے مطابق بابا عبدالکریم کو منصورہ احمد کی خواہش پر مکان خالی کرنے کا کہا گیا جس سے وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہوئے اور بعد ازاں بیمار ہو کر وفات پا گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ایک اور واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ تیسرے روز ان کے داماد نے دفتر سے گاڑی طلب کی جو اس وقت

دستیاب نہ تھی۔ چنانچہ یونس جاوید نے گاڑی فراہم کر دی اور صرف ایندھن بھرنے کی ہدایت کی۔ اس پر منصورہ احمد نے سخت ناراضی کا اظہار کیا کہ دفتر کی گاڑی کسی کو بیرونی استعمال کے لیے کیسے دی گئی۔

یونس جاوید کے بقول جب انہوں نے دفتر کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور انہیں ادارے کا انچارج مقرر کیا گیا تو اس وقت ادارے کے مالی حالات نہایت خراب تھے۔ گرانٹ ختم ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ عدم ادائیگی کے باعث بجلی کے کنکشن بھی منقطع ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود وہ کسی قسم کی شکایت یا احتجاج سے گریز کرتے رہے۔ اسی دوران جب بعض افراد نے فرنیچر اور ایئر کنڈیشنر وغیرہ کے بارے میں سوال اٹھایا تو انہوں نے جواب دیا کہ انہیں اس بارے میں فی الحال کوئی معلومات نہیں اور وہ اس وقت دیگر انتظامی امور میں مصروف ہیں۔ یوں انہوں نے ان سوالات کو ٹال دیا۔ مصنف نے شبنم شکیل کا بتایا ہوا ایک واقعہ بھی شامل کیا ہے کہ ایک موقع پر احمد ندیم قاسمی اور منصورہ احمد اسلام آباد آئے تو ان کے قیام کا انتظام انہوں نے گھر پر کیا۔ ان کے مطابق منصورہ احمد نے ان کے گھر میں کچھ مخصوص انتظامات کیے جن کی وجہ سے گھر میں غیر معمولی صورتحال پیدا ہو گئی۔ یونس جاوید اس واقعے کو یوں نقل کرتے ہیں:

> "منصورہ کا بیڈ اپنے بیڈ روم میں سیٹ کرواتی رہی کہ ربط قائم رہے۔ مگر تین چار مرتبہ ایسا ہوا کہ ڈنر کے بعد کی گفتگو کے بعد منصورہ یہ کہہ کر کہ میں بابا کو دبا آؤں بابا کے پاس چلی جاتی تھی مگر جب واپس آنے کی بجائے اندر سے دروازہ لاک کر کے اندر ہی رہ جاتی تھی تو میرے بیٹے نے مجھ سے کئی سوال کر دیے۔ پھر اسی گھر میں نئی نئی بہو بھی آ چکی تھی اس کی اشاراتی مسکراہٹوں سے میں زچ ہونے لگی۔ منصورہ کو دبی زبان میں ذکر کر دیا آپ بتائیں میں بیٹے اور بہو کو کیا جواب دوں جب وہ اپنا کمرہ چھوڑ کر۔۔۔ شبنم نے اپنی نامکمل بات خاموشی سے مکمل کر دی۔"(۲۶)

شبنم شکیل کی طرف سے یہ واقعہ بیان کیے جانے پر یونس جاوید کو کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ ان کے مطابق وہ اس نوعیت کے حالات کو ایک مدت سے دیکھ رہے تھے۔ یونس جاوید نے شبنم شکیل سے کہا کہ بہتر ہوتا اگر وہ اس معاملے کا ذکر نہ کرتیں کیونکہ ان کے خیال میں اس کے سامنے آنے سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ان کے مطابق اس ماحول میں اکثر "باس از آلویز رائٹ" کا اصول غالب رہتا تھا اور اختلافِ رائے کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ اسی گفتگو کے دوران یونس جاوید نے عمومی انداز میں بڑھاپے میں پیدا ہونے والے جذباتی رجحانات پر بھی تبصرہ کیا۔ اس پر شبنم شکیل نے جواب دیا کہ عشق اور تخلیق دونوں بلند تر انسانی تجربات ہیں اور ان کا تقاضا بھی اعلیٰ اسلوب اور بہترین اظہار ہے۔ یونس جاوید شبنم شکیل کی گفتگو کو یوں بیان کرتے ہیں:

"ہاں۔۔۔میں مانتی ہوں، حق ہے۔ مگر محبوبہ کو بہن یا بیٹی نہ کہا جائے۔
عشق اعتراف چاہتا ہے۔ عشق کے اعتراف کا ادراک بھی ہونا چاہیے۔
جرات بھی۔۔۔ مجھے یاد آیا کہ کسی زمانے میں روزنامہ "خبریں" میں جاوید
چوہدری صاحب نے مشہور شاعر ظفر اقبال صاحب کا ایک انٹرویو شائع کیا
تھا جس کی ہیڈلائن یہ تھی "جب لڑکیاں بوڑھی ہو جاتی ہیں تو قاسمی صاحب
انہیں بیٹی بنا لیتے ہیں" اس پر بہت شور مچا تھا اور دیگر مسائل میں ظفر اقبال
کے خلاف کیا کیا گالم گلوچ والے مضامین شائع ہوتے رہے۔ پتہ نہیں وہ گم
نام لوگ کون تھے اور کیوں غلاظت نگاری پہ تلے ہوئے تھے۔"[۲۷]

مجموعی طور پر یونس جاوید کی آپ بیتی "صرف ایک آنسو" ایک غیر مکمل سوانح عمری کا تاثر دیتی ہے جس میں مصنف نے اپنی ذاتی زندگی کے تفصیلی حالات کم بیان کیے ہیں۔ ان کے ہاں بچپن کی چند یادیں، مدرسے کا تجربہ، تعلیمی سفر، ابتدائی ملازمتیں اور بالخصوص مجلسِ ترقیِ ادب، احمد ندیم قاسمی اور منصورہ احمد سے متعلق واقعات زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ مصنف نے اپنی نجی زندگی، خاندان، بیوی بچوں اور دیگر ذاتی پہلوؤں کو وہ جگہ نہیں دی جو عام طور پر ایک آپ بیتی کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کی پیدائش اور ابتدائی پس منظر سے متعلق معلومات بھی تفصیل سے سامنے نہیں آتیں۔ یوں پوری کتاب میں ایک ایسا اسلوب سامنے آتا ہے جس میں مصنف زیادہ تر بیرونی واقعات اور ادارہ جاتی تجربات پر توجہ دیتے ہیں۔ اس بنا پر یہ تاثر بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی خوبیوں اور پیشہ ورانہ کردار کے دفاع میں زیادہ متوجہ ہیں جبکہ اپنی کمزوریوں یا ممکنہ غلطیوں کا ذکر کم کرتے ہیں اور اکثر حالات و واقعات کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے خود کو براہِ راست تنقید سے الگ رکھتے ہیں۔

یونس جاوید کی آپ بیتی "صرف ایک آنسو" محض سوانحی بیان نہیں رہتی بلکہ بعض مقامات پر احمد ندیم قاسمی اور منصورہ احمد کے حوالے سے ایک مسلسل تنقیدی بیانیہ اختیار کر لیتی ہے جسے بعض قاری کیتھارسز یا جذباتی اظہار کی صورت بھی سمجھ سکتے ہیں۔ متن میں مختلف جگہوں پر ان دونوں شخصیات کے رویّوں کو بار بار موضوع بنایا گیا ہے جس سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں یہ کردار ایک نمایاں اور مسلسل موجود پس منظر کے طور پر رہے ہیں۔ اسی تسلسل میں آخری حصے میں شبنم شکیل کی روایت کو بھی شامل کیا گیا ہے جسے اپنے بیانیے کی تائید کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ آپ بیتی کی زبان نسبتاً سادہ اور رواں ہے۔ مصنف نے حالات و واقعات کو بیان کرتے ہوئے جزئیات نگاری سے بھی کام لیا ہے لیکن بعض مقامات پر منظر کشی قدرے طویل محسوس ہوتی ہے جس سے بیانیہ کہیں کہیں پھیلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بعض حصوں میں مرکزی موضوع سے ہٹ کر واقعات کو طول دیا گیا ہے جن میں خاص طور پر احمد ندیم قاسمی اور منصورہ احمد سے متعلق واقعات بار بار زیرِ بحث آتے ہیں۔ کتاب میں فلیش بیک کی تکنیک بھی متعدد مقامات پر برتی گئی ہے جس کے ذریعے ماضی

اور حال کے واقعات باہم جڑتے اور ایک تسلسل اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے جگہ جگہ انگریزی اور مقامی زبان کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جس سے تحریر میں ایک مخلوط لسانی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

یونس جاوید کی آپ بیتی ''صرف ایک آنسو'' ان کی شخصیت اور فنی جہات کو سمجھنے کے لیے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ایک ادیب کی زندگی کے نشیب و فراز کو سامنے لاتی ہے بلکہ مجلسِ ترقیِ اردو ادب کی نصف صدی سے زائد ادبی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں بھی آگاہی فراہم کرتی ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ پہلو بھی واضح ہوتا ہے کہ یونس جاوید کے ہاں تلخی اور احتجاج کا رنگ کیوں غالب ہے۔ آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تصنیف محض ایک فرد کی سرگزشت نہیں بلکہ ایک پورے عہد کا نوحہ ہے جو علامتی طور پر ''صرف ایک آنسو'' میں سمٹ آیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ یونس جاوید، صرف ایک آنسو، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء، ص:۷

۲۔ یونس جاوید، صرف ایک آنسو، ص:۸

۳۔ ایضاً، ص:۱۲

۴۔ ایضاً، ص:۱۴

۵۔ ایضاً، ص:۱۶

۶۔ ایضاً، ص:۱۷

۷۔ مقالہ نگار کا، یونس جاوید سے انٹرویو بمقام ۹۰۳، زیڈ بلاک، فیز تھری ڈی ایچ اے، لاہور، بتاریخ ۳۰ دسمبر ۲۰۲۵ء

۸۔ یونس جاوید، صرف ایک آنسو، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء، ص:۲۶

۹۔ ایضاً، ص:۲۸

۱۰۔ ایضاً، ص:۳۲

۱۱۔ ایضاً، ص:۲۸

۱۲۔ ایضاً، ص:۳۹

۱۳۔ ایضاً، ص:۴۰

۱۴۔ ایضاً، ص:۴۵

۱۵۔ ایضاً،ص:۴۸

۱۶۔ عامر سہیل، سید، یونس جاوید سے رسمی اور غیر رسمی گفتگو، مشمولہ: انگارے،ملتان: عاتکہ پرنٹنگ پریس، اگست ۲۰۰۵ء، ص:۱۸

۱۷۔ یونس جاوید،صرف ایک آنسو،ص:۵۲

۱۸۔ ایضاً،ص:۶۴،۶۳

۱۹۔ ایضاً،ص:۷۳

۲۰۔ ایضاً،ص:۷۷

۲۱۔ ایضاً،ص:۷۸

۲۲۔ ایضاً،ص:۸۹

۲۳۔ ایضاً،ص:۹۰

۲۴۔ عامر سہیل،سید،یونس جاوید سے رسمی اور غیر رسمی گفتگو، مشمولہ:انگارے،ص:۲۰

۲۵۔ یونس جاوید،صرف ایک آنسو،ص:۱۲۴

۲۶۔ ایضاً،ص:۱۳۹

۲۷۔ ایضاً،ص:۱۴۰

References:

1. Yunus Javaid, Sirf Ek Aansu, Islamabad: Dost Publications, 2021, p7.
2. Yunus Javaid, Sirf Ek Aansu, p. 8
3. Ibid, p. 12
4. Ibid, p. 14
5. Ibid, p. 16
6. Ibid, p. 17
7. Maqala Nigar ka Yunus Javaid se interview, bamaqam: 903, Z-Block, Phase 3, DHA, Lahore, batareekh: 30 December 2025
8. Yunus Javaid, Sirf Ek Aansu, Islamabad: Dost Publications, 2021, p.26
9. Ibid, p. 28
10. Ibid, p. 32
11. Ibid, p. 28
12. Ibid, p. 39
13. Ibid, p. 40
14. Ibid, p. 45

15.Ibid, p. 48
16.Aamir Sohail, Syed, "Yunus Javaid se Rasmi aur Ghair Rasmi Guftagu," mishmula: Angarey, Multan: Aatika Printing Press, August 2005, p. 18
17.Yunus Javaid, Sirf Ek Aansu, p. 52
18.Ibid, pp. 63, 64
19.Ibid, p. 73
20.Ibid, p. 77
21.Ibid, p. 78
22.Ibid, p. 89
23.Ibid, p. 90
24.Aamir Sohail, Syed, "Yunus Javaid se Rasmi aur Ghair Rasmi Guftagu," mishmula: Angarey, p. 20
25.Yunus Javaid, Sirf Ek Aansu, p. 124
26.Ibid, p. 139
27.Ibid, p. 140